ادبی تاریخ نویسی

(مرتبہ: ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر)

مبصر: ڈاکٹر روش ندیم

زیر نظر کتاب انتیس مضامین پر مشتمل ہے جنہیں تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے منعقدہ سیمینار "تاریخ ادب کی تدریس اور ادبی تاریخ نویسی" میں پڑھے گئے مقالات بھی شامل ہیں۔ حصہ اول چوبیس مضامین اور حصہ دوم پانچ مضامین پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں ادبی تاریخ نویسی کے اصول و ضوابط، تقاضوں، ماخذات، تاریخ و ارتقا، تدریس، اسلوب، آگہی اور دیگر لوازمات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ مضامین احتشام حسین، ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر محمد حسن جیسے ادبی زعما اور ڈاکٹر ضیاء الحسن، ایم خالد فیاض اور ڈاکٹر سید عامر سہیل جیسے نئے ادیبوں کے تفکر کا اظہار ہیں۔ حصہ دوم میں اردو ادب کی تین اہم ترین ادبی تواریخ کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے جبکہ حصہ سوم میں پندرہ مختلف اردو کے ادبی تاریخ نویسوں کے متعلقہ حوالے سے اقتباسات دیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں شامل مقالوں، مضمونوں اور مختصر مقالوں میں اردو ادب کی تاریخ نویسی اور تواریخ کو مختلف زاویوں سے موضوع بنایا گیا ہے۔ ادبی تاریخ نویسی کو اساسی سطح پر زیر بحث لانے والے اور اسی حوالے سے دعوت فکر دینے والے مضامین میں سے ادبی تاریخ از احتشام حسین، تاریخ ادب اردو کی تدوین از علی جواد زیدی، اردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی گئی؟ اور ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل از ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ادبی تاریخ نویسی از ڈاکٹر شگفتہ حسین اور ادبی تاریخ کیا ہے از ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر انتہائی اہم ہیں۔ ادبی تاریخ نویسی پر بنیادی مباحث احتشام حسین، علی جواد زیدی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، پروفیسر رضی عابدی، ڈاکٹر محمد سلیم ملک اور ڈاکٹر شگفتہ حسین کے علاوہ شاکر کنڈان نے کی ہیں ان کے مضامین یقیناً زیر نظر کتاب کا اہم ترین حصہ ہیں۔ اسی تسلسل میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر روبینہ ترین اور عبدالکریم خالد نے ادبی تاریخ نویسی کی تدریس پر لکھتے ہوئے اہم گوشوں کی نشاندہی کی ہے۔ ادبی تاریخ نگاری کے چند بنیادی لوازمات پر الگ الگ حوالے سے بات کرتے ہوئے تنقید، اسلوب، تاریخی شعور کو بالترتیب ڈاکٹر ناصر عباس نیر، محمد سعید، ڈاکٹر ضیاء الحسن اور ایم خالد فیاض نے موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر سید عامر سہیل اور نسیم عباس احمر نے اردو میں تاریخ نویسی کے تصور اور اس کے ارتقا پر اظہار خیال کرتے ہوئے ادبی تاریخ نویسی کے شعور پر بہت عمدہ تحریر پیش کیا ہے۔ دیگر مضامین میں سے چند ایک ایسے ہیں جن میں بلاواسطہ طور پر متعلقہ موضوع پر بات کی گئی ہے جبکہ باقی ماندہ موضوعات کا تعلق ادبی تاریخ نویسی کی بجائے بذات خود اردو کی ادبی تاریخ، اس کے جائزے یا ایسے ہی دیگر پہلوؤں پر ہے۔ مثلاً اردو کی ادبی تاریخوں، تذکروں اور ادبی تاریخ نگاری کی ابتدائی کاوشوں پر ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر صابر کلوروی، علی جواد زیدی، ڈاکٹر علمدار حسین بخاری، معین الدین عقیل اور نجیبہ عارف کی تحریریں براہ راست موضوع سے متعلق نہیں ہیں۔

آج کل ادبی تاریخ نویسی کو بطور مضمون کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے لیکن مرتبین کا کہنا بالکل بجا ہے کہ گو ہمارے ہاں بیسیوں ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں مگر "اردو میں تاریخ نویسی کے اصولوں اور تقاضوں کو بہت کم موضوع بنایا گیا ہے" (۱) اس کا

اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک ادبی تاریخ نویسی کے موضوع پر صرف دو ایک کتابیں ہی سامنے آئی ہیں۔ یعنی پہلی سعد مسعود غنی کے ایم فل کے مقالے کا ایک حصہ بعنوان ''ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اردو (ایک تحقیقی جائزہ)'' اور دوسری سلمان احمد کی مرتبہ ''اردو کی ادبی تاریخیں: نظری مباحث''۔ درحقیقت اب تک اس موضوع پر صرف مضامین و مقالات ہی لکھیں گئے ہیں جنہیں مذکور کتب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے بعض مضامین ان دونوں کتب میں مشترک بھی ہیں۔ ادبی تواریخ کے تحقیقی جائزے پر مشتمل ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' کے دو ابواب ''ادبی تاریخ نگاری'' اور ''اردو کی ادبی تاریخ کا ارتقا'' مذکورہ دونوں کتب میں بھی شامل ہیں۔

ادبی تاریخ نگاری دراصل تاریخ نویسی کی ہی ایک شاخ ہے۔ اس کے اصول، ضوابط، بنیادی لوازمات وہی ہیں جو کہ عام تاریخی کی بھی بنیاد ہیں۔ البتہ اس کا دائرہ کار ادب تک محدود ہوتا ہے بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیر ''ادبی تاریخ میں بنیادی اہمیت ادبی متون کو حاصل ہے۔ تاریخیت کے سرگانہ اصولوں کو ادبی مضمون پر ہی لاگو کیا جانا چاہیے اور مسلسل و ارتقا کی کڑیاں انہی متون کے اندر تلاش کی جانی چاہئیں۔'' (۲) لیکن ادبی تاریخ نویسی کی یہ محدودیت اسے بعض حوالوں سے عمومی تاریخ نگاری سے بھی زیادہ وسیع کر دیتی ہے۔ کیونکہ ادب کی تفہیم و تاریخ اور عمومی تاریخ کے امدادی علوم کافی حد تک مشترک ہیں اور سیاست، ثقافت، معیشت، معاشرت، نفسیات، جغرافیہ، مذہب، تصوف، اساطیر، لسانیات، فلسفہ اور بے شمار دیگر علمی شعبوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یوں اگر تاریخ ام العلوم ہے تو یہ ادب کے ساتھ مل کر فرد اور معاشرے کی داخلی و خارجی تمام تر تہوں تک رسائی کر لیتی ہے۔ ہمارے ہاں جو ماہرین ادب متذکرہ سماجی علوم کے ذریعے ادب کی تفہیم تک رسائی حاصل نہیں کرتے بلکہ اپنا مطالعہ محض تخلیقی ادب تک محدود رکھتے ہیں ان کا سماجی سیاسی اور تاریخی شعور ترقی نہیں کرتا۔ جس سے ایک خاص طرح کا ذہنی رویہ پیدا ہوتا ہے جسے طرز اُمدرسانہ، پروفیسرانہ یا نصابی انداز فکر کہا جاتا ہے۔ یہ انداز کسی بھی قسم کی فکری گہرائی و گیرائی سے عاری ادب کی تفہیم کو فنی و فکری خصوصیات کی سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کی تقسیم سے اوپر نہیں اٹھنے دیتا۔

ہمارے ہاں زیادہ تر ادب کے مؤرخین وہ لوگ رہے ہیں جن کا بنیادی تعلق تاریخ کی بجائے ادب اور ادبی تنقید اور تحقیق سے رہا ہے۔ ان کے ہاں تاریخ نویسی کا رویہ اساسی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی لیے ان کا زیادہ تر کام اسماء و سنین کی تصحیح، کتب کی مرحلہ وار ترتیب اور فن و شخصیت پر محض تبصرے تک محدود نظر آتا ہے۔ جبکہ بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری ادبی مؤرخ کا کام یہ معلوم کرنا ہے کہ ادبی پس منظر و پیش منظر میں سیاسی تاریخ، تہذیبی تاریخ، جنرل تاریخ، فلسفہ فکر اور سماجیات کا کس طرح کسی عہد کی ادبی تاریخ پر اثر پڑ رہا ہے اور ان اثرات کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں؟ یعنی ''۔۔۔ جب تاریخ کا جلوس اپنی ایک منزل پوری کر لے تو وہ اس بات کا جائزہ لے کر اس طویل یا مختصر سفر کے ثمرات اور حاصلات کیا ہیں؟ روایت کس حد تک آگے بڑھتی ہے؟ فکر و خیال کی سطح پر کیا تجربات کیے گئے ہیں؟ اس سفر میں کون سی تبدیلیاں ممکن ہو سکی ہیں؟ (۳)

اس حوالے سے ضروری ہو جاتا ہے کہ ادبی تاریخ نویس کے ہاں وہ بنیادی شعور اور رویہ موجود ہو جو ایک تاریخ نویس کا ہوتا ہے۔ اسے تاریخ نویسی کے بنیادی لوازمات سے آگاہی ہونا ناگزیر ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں عمومی اور ادبی دونوں طرح کی تاریخ نویسیوں کے تقاضے ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ جن ادیبوں کا تاریخی شعور اور بنیادی تربیت تاریخ نگاری کے حوالے سے نہیں ہوتی وہ ادبی تاریخ نگاری کا حق بھی پوری طرح ادا نہیں کر پاتے۔ تبسم کاشمیری ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ ''تاریخ کا تصور تاریخ کی حرکت کو ریکارڈ کرنے میں ہے۔ تاریخ کا تصور

تاریخی قوتوں کو دریافت کرنے میں ہے۔ ادبی مؤرخین جب صرف انفرادی ادیبوں کے کام پر ہی رک جائیں گے تو تاریخ کی حرکت رک جائے گی اور جب تاریخ کی حرکت رک گئی تو تاریخ، تاریخ کہاں رہے گی۔"(۴)

ادبی مؤرخ اور مدرس دونوں کو ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے اپنی وسعت وحدود کا علم ضرور ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے قاری اور طلبہ تک موضوع کا مکمل اور درست ابلاغ کر سکے۔ اس حوالے سے ضروری ہے کہ عام تاریخ اور ادبی تاریخ کے کردار، اہمیت اور باہمی فرق کا پوری طرح سے علم ہو۔ تاریخ کے بڑے بڑے نظریات، تصورات اور اقسام بھی ان کی نگاہ میں ہونی چاہئیں۔ خط مستقیم، آرا، پنڈولم، سپرنگ، دائرہ، عمود جیسی تاریخ کی مختلف حرکات اور طبقاتی، مادی، رومانوی، مذہبی، سیاسی، عوامی فلسفے اور نظریات کے علاوہ ابن خلدون، ویکو، کانٹ، ہرڈر، ہیگل، مارکس، شپنگلر، ٹائن بی، رسل اور ول ڈیورانٹ جیسے مفکرین اور ماہرین تاریخ کے تصورات سے آگاہی بھی نہایت ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہندستان، عالم اسلام، جدید یورپ اور دنیا کی عمومی تاریخ کا مختصر مطالعہ بھی ضرور ہو تاکہ ایک تاریخ نویس کا وژن اور شعور تشکیل پائے جس سے تاریخ کی ہمہ گیریت اور زمانی وسعت میں اس کی حرکت کا ادراک کا حصہ بن سکے جو ادبی تاریخ نویسی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ذہنی رویہ ہمارے ادبی مؤرخوں میں مفقود ہے جس کی شکایت ادبی مفکرین زیرِ نظر کتاب میں جگہ جگہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

دراصل ہمارے ہاں ادبی تاریخ نگاری کا سفر بھی ہماری عمومی تاریخ نگاری کی جبریت میں طے ہوا ہے جو ہمارے اجتماعی تاریخی شعور کے ارتقا کا بھی پتا دیتا ہے۔ ہماری تاریخ نگاری کی روایت اور اس کے تحت جو مختلف رجحانات ابھرے ان کا ادبی تاریخ نویسی میں در آنا ناگزیر تھا۔ جیسے ابتدائی جدید دور میں شبلی نعمانی کی شخصیت پرست تاریخ نگاری کے رجحانات متوازی ادبی تاریخ نگاری میں بھی نظر آتے ہیں اور عبدالحلیم شرر سے نسیم حجازی تک کی تاریخی ناول نگاری میں بھی۔ قدیم تذکروں اور ادبی تواریخ کے محض سوانحی پس منظر سے سماجی انداز نظر کی سمت ترقی کے باعث بعد از اں شخصیت، اس کی تخلیقات، اجتماعی رویوں اور رجحانات کو ماحول اور حالات کے تحت رکھ کر دیکھا جانے لگا لیکن انیسویں صدی کے اس اندازِ فکر کے بعد بیسویں صدی میں کئی نئے فلسفے سامنے آئے جن کے تحت تنقید و تجزیہ کے ساتھ تاریخ نویسی کے بھی نئے رجحانات ابھرے۔ لیکن ہم ابھی تک مجموعی طور پر عمرانی اندازِ فکر سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اسی لیے ہمارے ہاں ابھی تک دیگر فلسفوں اور نظریات کے تحت ادبی تاریخ نویسی سامنے نہیں آئی۔ ادبی اصول تاریخ نگاری کے حوالے سے مسئلہ علت، معاون علوم اور وسائل و ماخذات پر بھی بحث ضروری ہے۔ کسی بھی وقوعے یا متن کا جواز یا پس منظر ایسے ہی کسی عمل کا نتیجہ یا اثرات ہوتے ہیں۔ پس منظر و جواز۔۔۔ وقوعہ و متن ۔۔۔ نتیجہ و اثرات کی مثلث کا یہ لامتناہی سلسلہ ہی دراصل ارتقا ہے اور اس سلسلے کے زیر و بم کا مطالعہ درحقیقت تاریخ۔ اس ضمن میں تاریخ نگاری میں تنقید و تحقیق کا کردار اور ان میں توازن بہت اہم ہے کیونکہ ہمارے کلاسیکی ذہنی رویے کے حامل محققین نے تحقیق کے نام پر ادبی تواریخ کی روایت میں جو بگاڑ پیدا کیا ہے اس کا اثر گزشتہ تین نسلوں پر دکھائی دیتا ہے۔ اسلوب کے حوالے سے ادبی تاریخ نویسی کی مباحث کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تاکہ نہ تو محمد حسین آزاد جیسے انشائی اسلوب کو ماڈل تصور کیا جائے اور نہ ہی ڈاکٹر سلیم اختر کی مختصر ترین تاریخ کے ان حصوں کو جہاں وہ جھنجھلاہٹ، چڑچڑاپن اور غصے کا شکار ہو کر طنزیہ علامتی انداز اختیار کرتے ہیں جو دلچسپ تو ہو سکتا ہے لیکن قابل تقلید نہیں۔ ابتدائی تاریخ نگاری کی کاوشوں اور ادبی تاریخ کے وسائل و ماخذات بہت اہم موضوع ہے اور اس کے حوالے سے تذکرہ نگاری کا ذکر تو لازماً ہوتا ہے لیکن ضروری ہے کہ پاک و ہند میں عمومی تاریخ نویسی کی روایت اور اس میں انحرافات و تبدل پر بھی نگاہ ہونی چاہیے تاکہ تغیر پذیر رجحانات، جدید

تقاضوں اور روح عصر سے ہم آہنگی ممکن ہو سکے۔ یوں عہد جدید میں سرسید، رومانویت، ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحانات اور تحریکوں کے تحت پروان چڑھنے والے ان کے تصورہائے تاریخ پر بھی بات ہونی چاہیے۔ اردو ادب کی تاریخ نویسی میں گراہم بیلی، گارسیں دتاسی، رالف رسل، اینی میری شمل، میتھیوز اور شیکل جیسے مستشرقین کے کردار کے علاوہ انگریزی زبان میں لکھی گئیں سر عبدالقادر، ڈاکٹر محمد صادق، رام بابو سکسینہ اور علی جواد زیدی وغیرہ کی ادبی تواریخ بھی زیر بحث آنی چاہیے۔ ہمارے ہاں تاریخ وتنقید کے نئے تصورات یعنی نوآبادیات، بعد از نوآبادیات، جدیدیت و مابعد جدیدیت، ساختیات، ردِّتشکیلیت، مارکسیت و نو مارکسیت وغیرہ کے تحت ادبی تاریخ نویسی کے رجحانات و تصورات کا مطالعہ ابھی اردو کا حصہ نہیں بنا۔ اسی تسلسل میں نا صرف اردو کی اہم تواریخ بلکہ اہم ادبی مفکرین و مؤرخین کے تصورات کا تنقیدی تجزیہ بھی ہونا چاہیے۔ ادبی تاریخ نویسی کے ضمن میں کچھ مباحث کو تو بالکل نظر انداز نہیں ہونا چاہیے مثلاً سوانح، شخصیت، پروپیگنڈا، اصناف، ادبی تحریک، سیاسی نقطۂ نظر، تعصب، فن و فن کار کی درجہ بندی، فرد اور عوام، جغرافیہ، خاندان وغیرہ کا ادبی تاریخ نویسی سے تعلق اور اس میں کردار۔ یوں مذکورہ بالا بحث میں ادبی تاریخ نویسی کا جو دائرہ کار متعین کیا گیا اس میں سے کئی مقامات ایسے ہیں جنہیں زیر نظر کتاب کے ادیبوں کو اپنے غور و فکر کا حصہ بنانا چاہئے تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اگر ایک طرف ہمارا ادب کو سماجی علوم تحت دیکھنے اور پرکھنے کا رویہ مستحکم نہیں ہے وہیں دراصل روایتی ہند مسلم تہذیبی رویہ بھی تاریخ نگاری کو سائنٹیفک سطح تک تعقل پسند بنانے میں بہت معاون نہیں۔ ہماری علمی تاریخ میں ضیاءالدین برنی اور عبدالقادر بدایونی کی قرون وسطیٰ کی روایت تاریخ نگاری کے بعد نوآبادیاتی جدید عہد میں سرسید تحریک اور شبلی نعمانی نے نئی روایت تشکیل دی جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی فکر سامنے آنے سے ٹوٹی۔ لیکن وسیع سطح پر تصورِ تاریخ میں حقیقی تبدیلی ہمارے ہاں ستر کی دہائی سے شروع ہوئی۔ ہماری ادبی تاریخ نویسی بھی کچھ ایسے ہی رستے پر چل کر ہم تک پہنچی اور نوآبادیاتی دور کی ماورائیت، رومانیت اور اعتقادیت کی جگہ تعقل پسندی، سماجیت اور طبقاتی شعور لینے لگے۔ جمیل جالبی، تبسم کاشمیری، محمد حسن اور احتشام حسین کی تاریخوں میں یہ رویہ غالب دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر سید عامر سہیل اور نسیم عباس احمر کی مرتب کردہ ''ادبی تاریخ نویسی'' اسی طرح کی قابل قدر کاوش ہے جس طرح کی کاوش ہمارے جدید مؤرخین عموی تاریخ نگاری کے حوالے سے اجتماعی تاریخی شعور کو بلند تر کرنے کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔ یقیناً اس سے آئندہ طلبہ میں ادبی تاریخ کے حوالے سے ایک نئی آگہی کو فروغ ملے گا اور وہ ادبی تاریخ کو محض شاعروں ادیبوں کی ترتیب وار سوانح یا دبستان ہائے دہلی و لکھنؤ سے بڑھ کر بھی جاننے کی کوشش کریں گے جس سے ایک یہ احساس بھی یقیناً پروان چڑھے گا کہ وہ اپنی ادبی تاریخ کو کس طرح سے ادب کی عالمی تاریخ کے حصے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں اور اسے اپنی تہذیبی و ثقافتی انفرادیت کے ساتھ اس بڑے دھارے سے کس طور پر ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سید عامر سہیل، ڈاکٹر، نسیم عباس احمر (مرتبین) ''ادبی تاریخ نویسی''، لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۷

۲۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء، ص ۴۵

۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۱۱

۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل'' مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''، ص ۶۵